انسانیت کی تعمیرِ نَو اور اسلام

(عبد الحمید)

(۳)

مغرب میں جمہوریت کے ساتھ جو نظامِ معیشت پروان چڑھا اسے ہم سرمایہ دارانہ نظام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ معاشیات کے بہت سے اساتذہ نے اپنے قیمتی لمحات اور صلاحیتوں کو صرف اس کی تاریخ ولادت معلوم کرنے میں صرف کیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ چونکہ یہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کی پیداوار ہے اس لیے اس کی پیدائش اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اگرچہ اس "طفلِ شریر" کے بالغ ہونے کا زمانہ انیسویں صدی ہے مگر اس کی پیدائش قرونِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام میں ہو چکی تھی۔

جب ہم اس ساری بحث کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ سب کچھ عبث اور بیکار نظر آتا ہے۔ نظام ہائے حیات افراد کی طرح دنیا میں جنم نہیں لیتے بلکہ ان کا بروز و ارتقاء درخت کی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی فنا اور بقا کے قوانین بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق بھی تیقن کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فلاں سن میں پیدا ہوا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ "مادیت پرستی" کا یہ "طفلِ شریر" انیسویں صدی میں اپنے شباب کو پہنچا۔ ایک المانوی عالم فرٹز سٹرن برگ (Fritz Sternberg) اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"سرمایہ دارانہ نظام کو موجودہ حالت پر پہنچنے کے لیے سالہا سال لگے۔ اس کے ارتقاء کی رفتار پہلے بہت سست تھی مگر انیسویں صدی کے آخر سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک اس نظام نے اتنی حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا تسلط ساری دنیا پر قائم ہو گیا۔"[1]

[1] Capitalism and Socialism on Trial

اس وقت ہمارے پیش نظر اس نظام کی ارتقائی منازل کی نشان دہی نہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف اس کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا ہے۔ آج کل سرمایہ داری کی اصطلاح کسی ایسے نظام کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس میں پیدائش دولت کے آلات و وسائل افراد کی ذاتی ملکیت ہوں اور جو اشیاء پیدا کی جائیں اُن کی تقسیم کا کام بھی اُنہی کے ہاتھوں انجام پاتے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی معاشی جدوجہد ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہو۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا نہایت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اس نظام کو صرف ایک خاص قسم کی معاشی ہیئت خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک شدید غلط فہمی ہے جس کا شکار بعض بڑے بڑے تعلیم یافتہ آدمی بھی ہیں۔ سرمایہ داری ایک فلسفۂ زندگی اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ایک دین ہے جس نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق پچھلے سو سال میں نہ صرف یورپی زندگی کو بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا۔

سب سے پہلے ہم اس نظام کی بنیادوں کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے ہیں:

(۱) اس نظام کی خشتِ اوّل یہ ہے کہ افراد کو شخصی ملکیت کا غیر محدود حق حاصل ہے۔ اس میں لوگوں کو نہ صرف روزمرہ کے استعمال کی اشیاء رکھنے کی آزادی ہے بلکہ وہ اس امر میں بھی آزاد ہیں کہ آلات و وسائل کی پیدائش سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں۔ وہ جو کام چاہیں کریں۔ جہاں اُن کا جی چاہے کارخانے لگائیں، جس چیز سے انہیں نفع کی توقع ہو پیدا کریں، اور جس قیمت پر اور جن طریقوں سے اپنا مال بیچنا چاہیں بیچیں۔ ان سارے معاملات میں اُن پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ نفع کی صورت میں انہیں جو کچھ حاصل ہو وہ اُسے بلا شرکتِ غیرے اپنے مصرف میں لے آئیں۔ اسی طرح نقصان کا بوجھ بھی وہ تنہا برداشت کرنے پر آمادہ ہوں۔ سماج کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ کسی کے کام میں مداخلت کرے۔ نظامِ سرمایہ داری یہ حقوق لوگوں کو اس لیے دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کسب و ہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اسی صورت میں رونما ہوتے ہیں جب ان کے لیے کوئی جذبہ یا کشش موجود ہو۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ اپنی

محنت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ دراصل ملکیت کی خواہش ہی ایک ایسی آرزو ہے جس کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے۔

(۲) انسان کی اس خواہش کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی ذات کے لیے کوشش کرے۔ اور اس سعی کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو وہ اس کا مالک بنے۔ یہی ایک جذبہ انسانی کوششوں کا اصلی محرک ہے۔ اس کارگہ حیات میں جتنی رونق ہے وہ اسی کے دم قدم سے ہے۔ یہ جس قدر تگ و دو ہے سب ذاتی نفع کے حصول کے لیے ہے۔ نبضِ حیات میں تموّج ہے تو اسی کی وجہ سے اور نظامِ عالم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ ذہنِ انسانی سے اگر یہ جذبہ نکل جائے تو ہنگاموں اور شورشوں کی پُرشوکت دنیا راہبوں کی جھونپڑی اور سنیاسیوں کی کٹیا بن جائے۔ لہٰذا انسانی ترقی کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ مادی نفع حاصل کرنے کے لیے امکانی حد تک جدوجہد کرے۔ اُس کی کوششوں کا اصل مقصود یہ ہونا چاہیے کہ وہ چھین جھپٹ کے لیے بھرپور ہاتھ مارے اور اپنی حاصل کی ہوئی دولت میں کم سے کم لوگوں کو شریک ہونے کا موقع دے۔ جب وہ آجر ہو تو اس کی نگاہیں کثیر تنخواہ پر مرتکز ہوں اور مستاجر ہونے کی شکل میں اُس کا گوہرِ مراد زیادہ سے زیادہ نفع کا حصول ہو۔

(۳)۔ اس نظام کا تیسرا اصول مسابقت ہے۔ یہ مسابقت نہ صرف مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان پائی جاتی ہے بلکہ ایک ہی طبقہ اور ایک ہی گروہ کے مختلف افراد میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جہد للبقاء (Struggle for Exiatance) کی کوکھ سے نکلی ہوئی اس ڈائن نے ایک ملک کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو تاخت و تاراج کیا ہے۔ مگر اس کے سحر کا کمال یہ ہے کہ لوگ تباہی کے عمیق غاروں کی طرف لڑھکتے ہوئے بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ترقی کے بامِ بلند پر جا رہے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ مسابقت نہ صرف بے قید معیشت میں اعتدال پیدا کرتی ہے بلکہ یہ کثیر پیداواری اور نمود پیداواری کا سب سے بڑا محرک بھی ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو لوگوں کو ایجاد و اختراع پر ابھارتا ہے۔ پروفیسر سلگ مین (Selygman) مسابقت کا ذکر

کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"جس طرح حیاتیات میں مسابقت ترقی کی ضامن ہے، اسی طرح معاشی رقابت سے ہی سماج کی فلاح وابستہ ہے۔ اسی سے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب یہ جذبہ ذاتی ملکیت کی رہنمائی میں اپنا عمل شروع کرتا ہے تو یہ ترقی کے لیے سب سے بڑا محرک ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ ہم اشیاء سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہ جذبہ سماج کا سب سے بڑا پاسبان اور محافظ ہے۔ یہ صارفین (Consumers) کو نفع اندوزوں کی دست بُرد سے بچاتا ہے۔ افراد کے اندر استعداد پیدا کرتا ہے۔ اور سماج اور فرد کے مفادات کو ہم رنگ اور ہم آہنگ بناتا ہے۔"[1]

(۴) اس نظام کا چوتھا اصول یہ ہے کہ اجیر اور مستاجر کے حقوق میں بنیادی فرق ہے اور اسے رکھ کر ہی ان کے باہمی مسائل کو طے کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پورا سماج دو ایسے طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے جن کی باہمی کشمکش سے ہی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے اور دوسرا گروہ محنت کو فروخت کرنے والوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا طبقہ اپنی ذمہ داری پر اوّل سے آخر تک اشیاء کی پیدائش کرتا ہے اور نفع کی صورت میں پیدا دولت خود سمیٹتا ہے۔ اس کے برعکس جب نقصان ہو تو اس کا بوجھ بھی اُسے اکیلے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مزدور پر کسی قسم کی آنچ نہیں آتی۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر سرمایہ دار نہایت سنگدلانہ سے سنگدلانہ کارروائیوں کو مبنی بر انصاف سمجھتا ہے۔ اس بے انصافی کو جائز ثابت کرنے کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر کسی آفت کے وقت سرمایہ دار پورا نقصان خود برداشت کرتا ہے اور اس میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے بچنے کے لیے یا اس کو پورا کرنے کے لیے مزدوروں کا جس قدر خون چاہے نچوڑے۔

اس طرزِ فکر نے سماج کے دو طبقوں کے درمیان اختلاف کی ایک نہایت ہی گہری

---

[1] Principle of Economics (Book III)

خلیج حائل کر دی ہے اور یہ خلیج دن بدن وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت اور مؤدت کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ سرمایہ دار ہر وقت اس ٹوہ میں رہتا ہے کہ وہ مزدور سے جتنا زیادہ سے زیادہ کام لے وہی اس کے حق میں فائدہ مند ہے۔ اسی طرح مزدور کو بھی یہ فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے کہ وہ پیدائش میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرے۔ اس رقابت نے دشمنی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دونوں گروہوں کے سینے نفرت کی مشتعل آگ سے پُر ہیں، جن سے سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز انگاروں سے کچھ نہیں نکلتا۔ دشمنی کے اس آتش گیر مادے نے متعدد ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور اب بھی دل گیتی کی دھڑکنیں مزید بربادی کی دہائی دے رہی ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس تباہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کشمکش کو بالکل فطری سمجھتے ہیں اور ان کا یقین ہے کہ یہ فطری کشمکش فطری قوانین کے تحت خود بخود کسر و انکسار سے گزر کر اجیر و مستاجر کے درمیان حقوق کا توازن قائم رکھے گی۔

(۵) اس نظام کا ایک اور اصول یہ ہے کہ معیشت کی فلاح و ترقی اور اس کے فطری نتائج کے ظہور کا دارومدار ریاست کی عدم مداخلت پر ہے۔ ریاست کا کام صرف یہی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ انفرادی آزادیٔ عمل زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو سکے۔ لوگ نہایت ہی امن و امان سے معاشی تگ و دو میں مصروف رہ سکیں اور ریاست ان کے حقوقِ ملکیت اور معاہدات (Contracts) کی پوری طرح نگہداشت کرے۔

(۶) اس عہد کے نظامِ سرمایہ داری کی گاڑی جن پہیوں پر چل رہی ہے وہ سود اور سٹہ Speculation) ہیں۔ آج سے ایک صدی پیشتر سرمایہ لگانے والے اور صنعتی کاروبار انجام دینے والے اشخاص الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں سرمایہ دار اپنا کاروبار خود چلاتا۔ اس کا پورا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھ میں ہوتا۔ جب کبھی پیداوار میں کمی بیشی کرنا مقصود ہوتی تو اس کا فیصلہ بھی وہ خود ہی کرتا۔ مگر دورِ جدید میں بیش قیمت مشینوں کے استعمال نے ایک فرد کے لیے کسی کاروبار کا تن تنہا چلانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بنا دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ

کاروبار کا تجربہ رکھتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ کے لیے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں۔ ان حالات میں جبکہ دولت کا حاصل کرنا انسانی حیات کا اصل مقصد قرار پایا ہے کون بیوقوف ایسا ہوگا جو لوگوں کو دولت صرف اس لیے دے کہ وہ جا کر اس کو اپنے کاروبار میں لگائیں اُس سے مزید دولت حاصل کریں اور بعد میں اصل رقم اپنے اس "محسن" کو واپس دے دیں۔ آج کے سرمایہ دار کا مطالبہ یہ ہے کہ اُسے اُس کے سرمایہ کے استحصال کا ایک معقول "معاوضہ" ملنا چاہیے۔ چنانچہ اُس کے اس مطالبہ کی صحت پر یقین کرتے ہوئے سرمایہ دار کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ کاروبار خواہ فائدہ میں جا رہا ہو یا نقصان میں سرمایہ دار کو اپنی محنت (جو اُس نے دولت کے جمع کرنے میں صرف کی ہے) کی "مزدوری" مل جاتی ہے۔ اس کو کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اُسے اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ اُس کا دیا ہوا روپیہ کن کاموں پر صرف ہو رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ اصول جن پر نظامِ سرمایہ داری قائم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے اصول غلط نہیں۔ ان میں کسی حد تک صداقت بھی ہے۔ آغاز میں جب ان کو آزمایا گیا تو نہایت ہی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اشیاء کی پیدائش میں محیر العقول ترقی ہوئی۔ افراد خوش حال ہوتے۔ مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد جب لوگوں کا خمار اترا اور اس نظام کی چوٹوں نے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا تو پھر لوگوں کو اس کی تلخیوں کا احساس ہوا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دولت میں اضافہ ہوتے دیکھا مگر ساتھ ہی اُن کے سامنے یہ حقیقت بھی آئی کہ یہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ رہی ہے۔ اگر انہوں نے ایک طرف عیش و آرام کی زندگی کے مختلف مناظر دیکھے تو دوسری طرف اُن کے سامنے خستہ حالی افلاس اور غربت کے بھی نہایت ہی گھناؤنے واقعات آئے۔ اس تفاوت نے انہیں چونکا دیا اور وہ اس بات کو سمجھ گئے کہ یہ نظام سراپا خیر نہیں بلکہ اس میں شر کے بھی بے شمار پہلو ایسے ہیں جن کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ اس نظام کی فکری لغزشوں کی نشان دہی کرتے ہیں:۔
اس نظام کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ

اس میں خرابی کی اصل جڑ اس کا غلط فلسفۂ زندگی ہے۔ بے جان اشیاء کی کثیر پیداواری اور زود پیداواری نے انسان سے اُس کی حقیقی قدر و قیمت چھین لی ہے۔ اب اگر اُس کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے تو اسے بھی بے جان شے سمجھ کر طلب اور رسد کے قوانین کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کے معیشت دانوں نے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان صرف چند دھاتوں کا مرکب ہی نہیں بلکہ وہ زندگی کے جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ فطرت نے اُسے ایک خاص ذوق بخش رکھا ہے۔ اس میں اخلاقی حس بھی ودیعت کی گئی ہے۔ اس لیے اُس کی پیدائش اور اُس کے کام کو اشیاء کی پیداواری اور اُن کے استحصال پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مگر بدقسمتی سے دورِ حاضر کے فلاسفہ نے انسان کو بھی "کارخانہ کا تیار شدہ مال" سمجھ کر یہ "فتویٰ" صادر کر دیا ہے کہ اس کی "خرید و فروخت" میں بھی قیمت ہی وہ اصل ثالث ہے جو نہایت ہی انصاف کے ساتھ ہر مستحق کو اُس کا اصل حق دلا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ اصل خرابی جو اس نظام میں موجود ہے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت سے کسی قدر واقف ہے کہ کسی شے کی قیمت کا تعین رسد (Supply) اور طلب (Demand) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کی رسد کم اور طلب زیادہ ہو تو اُس کی قیمت خود بخود بڑھ جائیگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نفع کے روشن امکانات کے پیشِ نظر لوگ ان اشیاء کو زیادہ مقدار میں پیدا کریں گے۔ اس طرح رسد کے بڑھنے کی وجہ سے قیمتیں خود بخود اعتدال پر آجائیں گی۔ مگر اسی اصول کو جب انسانوں پر نافذ کیا جائے تو یہ انسانیت پر ایک عظیم ظلم ہوگا۔ فرض کیجیے کہ ایک پیشہ ایسا ہے جس میں مزدوروں کی افراط ہے مگر اُن کی طلب نہیں۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انسانوں کی ایک بھاری تعداد کو جلد از جلد ایسے پیشوں کی طرف منتقل کریں جن میں اُن کو آسانی سے کھپایا جا سکتا ہو۔ مزدوروں کی محنت کو ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بیچارے پیٹ کے بے رحم تقاضوں کے ہاتھوں اپنی محنت کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ فاقہ مستی ان کو خود بخود کھینچ کر سرمایہ دار کے قدموں میں لا ڈالتی ہے۔ سرمایہ دار اُن کی اس بے بسی اور بے کسی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُن کو کم سے کم اُجرت پیش کرتا ہے اور اُن بیچاروں کو حالات کی سنگینیں اسی پر

رضامند کر لیتی ہیں۔

جو لوگ قیمتوں کے نظام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تنہا ہر فریق کو اُس کے جائز حقوق دلوا سکتا ہے وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پیدائش کرنے والے مختلف عاملین (Factors of Production) ایک جیسی طاقت نہیں رکھتے۔ ان میں بعض زیادہ مضبوط ہیں اور بعض اُن کے مقابلہ میں بے حد کمزور۔ اگر چاروں عاملین (زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم) ایک جیسی قوت کے مالک ہوتے تو سماج میں ہر مستحق کو اپنا جائز حق مل جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دورِ جدید کے معاشی نظام میں سب سے زیادہ طاقتور گروہ سرمایہ داروں اور منتظمین کا ہے۔ اس کے بعد زمین کے مالکوں کا طبقہ ہے اور سب سے کمزور اور لاچار مزدور ہیں۔ منڈی پر جب کبھی آفت آتی ہے تو اُس کی سب سے زیادہ زد محنت بیچنے والوں پر پڑتی ہے منتظمین (Enterpreneurs) جب یہ دیکھتے ہیں کہ قیمتیں گر رہی ہیں اور اُن کے منافع کم ہو رہے ہیں تو وہ سرمایہ کاری (Investment) میں کمی کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کارخانے بند ہونا شروع ہوتے ہیں اور کاروبار ماند پڑ جاتا ہے۔ ملک کا امیر طبقہ اپنی پس انداز دولت کے ہوتے ہوئے اتنی سکت رکھتا ہے کہ نہایت ہی آرام سے مصیبت کے یہ دن گزار دے۔ اُسے اشیا سستی ملتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ایک ایک پیسے کے بدلے کئی کئی پیسوں کا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ پھر اُس کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے وہ " اتفاق کی برکتوں سے بھرپور متمتع " ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک لگی بندھی تجویز کے مطابق یہ لوگ نہایت ہی ہوشیاری سے اشیاء کی رسد کم کر کے منافع کو کم نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح سرمایہ دار بھی پیدا وار میں " جزوِ اعظم " (Main Factor) کی حیثیت سے داخل ہونے کی وجہ سے اپنا " طے شدہ معاوضہ " حاصل کر لیتا ہے۔ اُسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اُس کی اس پالیسی سے کتنے لوگوں پر مصیبت ٹوٹتی ہے۔ اُسے بہر حال اپنا حصہ لینا ہے۔ کیونکہ یہ معاہدہ ہے اور اس کی پابندی کرانا نہ صرف لوگوں کا بلکہ حکومت کا اولین فرض ہے۔ زمین کے مالک بھی نسبتہً مضبوط پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر منافع میں سے کچھ نہ کچھ

حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ اب میدان میں باقی ایک طبقہ ایسا رہ جاتا ہے جس کو سب سے زیادہ کمزور اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے نہایت ہی آسانی سے مصائب کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔ جسم و روح کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے روکھی سوکھی روٹی چاہیے۔ اسی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا تن ڈھانکنے کے لیے اُسے کپڑے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دو مطالبات اتنے شدید ہیں کہ ان کو روزگار کے مہیا ہونے تک اٹھایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے جب کام ہوتا ہے تو یہ طبقہ تلاش روزگار میں در در کی خاک چھانتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے "اے رزق کے مالکو! تمہارا جو جی چاہے ہمیں دو۔ مگر خدارا ہمیں موت کے منہ سے بچاؤ"۔ سرمایہ دار اس کی مظلومیت اور بے سروسامانی کو دیکھ کر کساد بازاری کی ساری بربادیوں کو اُس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اُس نے اپنے ظلم و استبداد کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت سے یہ بات بحیثیت اصول کے منوا لی ہے کہ وہ لوگوں کے "کاروباری معاملات" میں کوئی دخل نہیں دے گی۔

پھر اس نظام کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جو بالعموم سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مسند اقتدار پر آتے ہی اس لیے ہیں کہ اپنے حقوق کی ہر طرح سے حفاظت کر سکیں۔ اس لیے ان کے وجود سے ان کے اپنے گروہ کے آدمی تو عیش لوٹتے ہیں مگر دوسرے طبقے خصوصاً "تبدۂ مزدور" کی زندگی نہایت تلخ ہو جاتی ہے۔

پچھلی ایک صدی کے واقعات نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ بغیر کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے سوسائٹی میں انصاف اور عدل قائم نہیں رہ سکتا۔ جب لوگوں کی زندگی کا منتہائے مقصود دنیوی فوائد و لذائذ سمیٹنا ہو تو پھر ان کی نظروں سے جائز و ناجائز کی تمیز بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں رہتی کہ اُن کے آمدنی کے ذرائع کن کن طریقوں سے سماج میں ظلم و ستم، بے حیائی اور بدمعاشی کو ترقی دے رہے ہیں۔ دولت کے پجاری کی حیثیت سے اُس کا نقطۂ نظر صرف یہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُسے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنی چاہیے، خواہ اُس سے اُس کی قوم اور ملت یا پوری انسانیت کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی آمدنی شراب

کی فروخت، رقص و سرود کی محفلیں سجانے اور فحش لٹریچر کی اشاعت اور اخلاق سوز تصویریں دکھانے سے بڑھتی ہے تو فوراً اپنا روپیہ ان کاموں میں کھپا دیتا ہے اور قطعاً محسوس نہیں کرتا کہ اس کی ان حرکات سے سماج کو بحیثیت مجموعی کس قدر خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، کتنی عصمتیں لٹتی ہیں، کتنی عفتیں برباد ہوتی ہیں، کتنے نوجوان آوارگی کا شکار ہوتے ہیں اور کتنے افراد مجرم بنتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سرمایہ کاری کا رُخ فواحش کی طرف موڑ دینے سے ضروریات زندگی کم یاب بلکہ نایاب ہو جاتی ہیں۔ عوام گندم کے ایک ایک دانے کے لیے ترستے ہیں، انہیں موسمی ضروریات، کے لیے تو کیا اپنا ستر تک چھپانے کے لیے کپڑا نہیں ملتا۔ اُن کے بچے دودھ کے ایک ایک قطرے کے لیے بلکتے ہیں اور اُس کے برعکس دوسری طرف سرمایہ داروں کی دولت پرستی اور نفع اندوزی کے طفیل انسانوں کا ایک قلیل طبقہ رفیع الشان محلات میں رہ کر اپنا سارا وقت عیش و تنعم میں بسر کرتا ہے۔ وہ دل جو خوفِ خدا سے خالی ہوں، جن کے اندر احساسِ جواب دہی ناپید ہو وہ اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ لوگوں کے بڑے سے بڑے مصائب اُن کے اندر معمولی سے معمولی ارتعاش بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اُن کی کیفیت یونان کے اُن فرضی خداؤں کی سی ہوتی ہے جو بلندیوں پر رہ کر صرف اپنے دھن دولت کے متعلق سوچ سکتے ہیں اور اپنے ذہن کو کبھی اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں پاتے کہ اُن کی ذات سے انسانیت کتنے دکھوں میں مبتلا ہے۔ ایسے لوگوں کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ صرف قسمت کا قاضی سماج میں عدل و انصاف قائم رکھ سکے گا۔ جو لوگ اس طرز پر سوچنے کے عادی ہیں وہ جنت الحمقا میں بستے ہیں۔

جدید سرمایہ داری کی ایک اور لعنت بے روزگاری ہے۔ انسان نے جب بھاپ سے فائدہ اُٹھانا سیکھا تو پیداوار میں نہایت ہی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا۔ جو کام کئی سو انسان کئی دنوں میں کر سکتے تھے وہ اب ایک آدمی مشین کی مدد سے چند منٹوں میں کرنے لگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سرمایہ دار ہمیشہ اس تلاش میں رہتا کہ وہ انسانوں کی تعداد گھٹا کر اُس کی بجائے مشینوں کے استعمال کو بڑھا دے۔ کیونکہ اس سے نفع میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ افراد کی جگہ مشینوں نے لینا شروع کی جب

ملک کے پورے طول و عرض میں اسی پالیسی پر عمل ہونا شروع ہوا تو ہزاروں نہیں لاکھوں انسان بیروزگار ہو گئے۔ وہ کام حاصل کرنے کے لیے جس کارخانے کی طرف بھی رجوع کرتے کلوں کی گڑگڑاہٹ انہیں یہ تبا دیتی کہ بھاپ کے دیو کی خدمت گزاری نے اب انسانی محنت کی ضرورت باقی نہیں رہنے دی۔ لہٰذا اب اس آسمان کے نیچے اُن کے لیے کوئی کام نہیں، اس لیے انہیں دنیا سے جلد از جلد کوچ کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ ایشیائی ممالک میں اس مسئلہ نے جو صورت پیدا کر دی ہے اگر ہم اُس کو فی الحال نظر انداز بھی کر دیں تو یورپ کے صنعتی ممالک میں بے روزگاری کا جو حال ہے اُس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۶۹۰۰۰ افراد
اٹلی	۳۰۹,۰۰۰ "
آسٹریا	۲۲۵,۰۰۰ "
پولینڈ	۱۷۰,۰۰۰ "
برطانیہ	۱۲,۰۴,۰۰۰ "
جرمنی	۲۴۸۴,۰۰۰ "

اس بیروزگاری نے سماج میں بے شمار کاروباری پیچیدگیاں ہی پیدا نہیں کیں بلکہ اس نے اُن گنت اخلاقی اور ذہنی بیماریوں کو بھی جنم دیا ہے۔

اس عہد میں جن خوش نصیبوں کو روزگار ملتا بھی ہے وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ اپنی درماندگی کی وجہ سے مزدور اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے جائز حقوق حاصل کر سکیں۔ اُن پر جس قدر کرم فرمائی کی جاتی ہے وہ اُن کا دو وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی ناکافی ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دار ہر آن اشیاء کی پیدائش میں مصروف رہتا ہے اور پھر ان کے نکاس کی تدبیریں بھی سوچتا ہے مگر لوگوں کی اکثریت بے روزگار یا نیم بے روزگار ہونے کی وجہ سے اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ کارخانے کے تیار شدہ مال کو خریدے۔ سرمایہ دار اپنے مال کی کھپت کے لیے سب سے پہلے انہیں

بے بس عوام کی طرف دیکھتا ہے جنہیں اُس نے دھکے دے کر نہایت ہی کس مپرسی کی حالت میں اپنے کارخانے سے نکال دیا تھا۔ سرمایہ داری نظام میں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کو دُور نہیں کیا جا سکتا۔ مزدور جب روزگار مانگتا ہے تو وہ سرمایہ دار کا دشمن ہے۔ اُسے اس "مٹی" کی مشین کے مقابلہ میں "لوہے کی مشین" زیادہ عزیز ہے۔ مگر جب اسے اس مشین کے تیار شدہ مال کو فروخت کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ پھر مجبوراً اپنے آپ کو اسی طبقہ کا محتاج پاتا ہے۔ مختلف حیلوں اور بہانوں سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس کے مال کو خریدیں۔ سرمایہ داری نظام میں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کو دُور کرنے کے لیے انسان کو اشتراکیت اور فسطائیت ایسی خوفناک راہیں تلاش کرنا پڑیں۔ مشہور مصنف ایرک گل (Eric Gill) اسی چیز کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد اور استعمال کا سب سے بڑا مقصد انسانی محنت کی بچت ہے۔ لہٰذا ہمیں مشین کو نہیں انسانوں کو ختم کرنا ہے مگر وہ انسان جسے ہم دنیا سے مٹا دینے کے آرزومند ہیں وہ وہ انسان ہے جو کارخانہ میں کام کرتا ہے۔ نہ کہ گلی میں بسنے والا انسان۔ محلوں میں رہنے والے انسان ہمارے ساتھی ہیں وہ ہمارے دوست ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح پیدائش میں انسانی محنت کے دخل کو ختم بھی کیا جائے اور دوسری طرف صارفین (Consumers) کی تعداد اور اُن کی قوتِ خرید کو بھی بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے، جڑ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی ہے"[1]

عہدِ حاضر کی استعماریت (Imperialism) اسی طرزِ فکر کا شاخسانہ ہے۔ جب کسی ملک کا سرمایہ دار طبقہ یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی اپنی غلط روش اور ناعاقبت اندیشانہ بلکہ ظالمانہ طرزِ عمل سے اُس کی اپنی قوم کے افراد اس قدر غریب اور مفلس ہو گئے ہیں کہ ان میں اس کے تیار کردہ

[1] Eric Gill Money and morals

مال کو حاصل کرنے کی ہمت نہیں رہی تو وہ پھر ملک سے باہر منڈیوں کی تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ اس عہد کا مغربی استعمار محض ایک قسم کی منظم تجارت اور مسلسل و مستقل مادی انتفاع ہے جس کی کوئی بلند اخلاقی یا دینی غرض اور کوئی اصلاحی و تہذیبی اور شریفانہ مقصد نہیں۔ سر ولیم جانسن ہاک نے جو ۱۹۲۵ء میں برطانوی وزارت کے رکن تھے۔ پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا:

"ہم نے ہندوستان اس لیے فتح نہیں کیا کہ ہم ہندوستانیوں کو نفع پہنچاتے رہیں گے۔ مجھے علم ہے کہ ہمارے مسیحی مشنری اپنے جلسوں میں کہا کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان اس لیے فتح کیا کہ ہندوستانیوں کے مرتبہ میں ترقی ہو۔ یہ دعویٰ محض دھوکا ہے۔ ہم نے ہندوستان اس لیے فتح کیا ہے کہ برطانیہ کے مال و اسباب کے فروخت کے لیے ایک منڈی ہاتھ آئے ..... میں منافق نہیں جو یہ کہنے لگ جاؤں کہ ہم ہندوستانیوں کے نفع کے لیے ہندوستان پر قبضہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر ہمارا قبضہ انگریزی تجارت خصوصاً لنکا شائر کے سوتی کپڑے کی منڈی کی حیثیت سے ہے[1]"

اسی طرح سر رجنالڈ کریڈک، سر مائیکل اوڈوائر، لارڈ لڈنہم، جنرل سر کلاڈ جیکب، اور مشہور مورخ سر چارلس اڈمین کی ایک متحدہ تاریخ کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

"ہندوستان ہماری مصنوعات کا دنیا میں سب سے بڑا گاہک ہے، برطانیہ جیسی کوئی تجارتی قوم ایسے گاہک کو بغیر اپنے آپ کو نقصان عظیم پہنچائے ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی اور یہ نقصان برداشت کرنے والے کون ہیں، ہمارے بینک، ہماری جہازی کمپنیاں، ہماری صنعتیں، ہمارے تنخواہ دار ملازمین اور ہمارے مزدوری پیشہ طبقے[2]"

ان منڈیوں کی ضرورت صرف ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ ساری مغربی اقوام کو ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے لیے وسیع سے وسیع تر منڈی تلاش کرے جہاں اس کے مال کی کھپت ہو سکے۔ اس ایک شکار کی تلاش میں جب بہت سے شکاری نکلیں تو ان کے اندر باہمی

[1] بحوالہ مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟ از مولانا ابوالحسن علی ندوی
[2] بحوالہ ایضاً

رقابت کا پیدا ہو جانا بالکل ایک قدرتی سی بات ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کی ساری جنگیں اسی خود غرضی کا نتیجہ ہیں۔ دور حاضر کا ایک مبصر اسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"یہ جنگ تو محض حریف جماعتوں کی ایسی کشمکش ہے جن میں سے ایک دنیا کی دولت اور آمدنی کے وسائل کے بڑے حصہ پر قابض رہنا چاہتی ہے اور دوسری اس کے حصہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگاتی ہے"

یہ عالمگیر لڑائیاں جنہوں نے اس صدی میں پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے نظام سرمایہ داری کا ضروری حصہ ہیں۔ استعماری ممالک جب ہوا کے رُخ کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے مال کی نکاسی مشکل ہو گئی ہے تو وہ پھر ایک سوچی سمجھی تجویز کے مطابق اس قسم کی چالیں چلنا شروع کرتے ہیں جس سے جنگ کے خطرات بڑھ جائیں۔ اس وجہ سے اُن کے مال کی طلب کچھ دیر کے لیے بڑھ جاتی ہے اور بیروزگاری وقتی طور پر اُن کے اپنے ملک سے غائب ہو جاتی ہے۔

منڈیوں پر قبضہ صرف قوت کے بل پر ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے لیے بعض اوقات ایسے حیلے اور بہانے اختیار کیے جاتے ہیں کہ اُن کے تصور سے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ ان میں ایک طریقہ مصنوعی ارزانی (Demping) ہے۔ اس میں صرف منڈی پر تسلط قائم کرنے کے لیے وہاں کثیر تعداد میں اشیاء نہایت ہی ارزاں بیچ دی جاتی ہیں۔ اور جب مخالفین اس ارزانی کی تاب نہ لاکر مقابلہ اور مسابقت کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اشیاء درآمد کرنے والوں کا یہ گروہ نہایت ہی آسانی سے اپنی من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ اس طریقہ سے سب سے زیادہ نقصان جس طبقہ کو پہنچتا ہے وہ مزدور ہے۔

یہی نہیں بلکہ دنیا کے دولتمند طبقے اپنے منافع کو ہر قسم کی دست بُرد سے بچانے کے لیے اکثر اوقات نہایت ہی ناپاک ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ اس کے لیے گندم کی کھڑی فصلیں جلا دی جاتی ہیں تاکہ اناج کی رسد بڑھ کر اُن کے منافع میں کمی نہ کر دے۔ مشہور مصنف جان گنتھر (Thon Gunthur) انہی اخلاق سوز حرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"۱۹۱۴ء میں برازیل کے ارباب ثروت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ پیدا شدہ کافی (Coffee) کو کس طرح کم کیا جائے۔ پہلے انہوں نے اس کو دفن کرنے کا عزم کیا۔ مگر اب مصیبت یہ آئی کہ ۴۰ لاکھ بوریوں کو دبانے کے لیے بھی کافی رقبہ درکار تھا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں سمندر میں پھینک دیا جائے مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے بیشمار مچھلیوں کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ بالآخر بہت زیادہ سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ اس کو جلا دیا جائے۔ چونکہ اس پودے میں پانی کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے اس لیے اس کو جلانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ آخر کارٹی کے تیل سے اس کو جلایا گیا۔ اس طرح برازیل کو ہر سال اس زائد پیداوار سے نجات حاصل کرنے کے لیے تقریباً ۲ لاکھ پونڈ کی مالیت کا تیل صرف کرنا پڑا۔"[1]

اسی طرح ایک دوسرا مصنف سرمایہ دار طبقہ کی اسی بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"۱۹۳۲ء میں لورپول کی بندرگاہ سے دس لاکھ سنگتروں کو سمندر کی موجوں کی نذر کر دیا گیا تاکہ رسد بڑھنے نہ پائے اور اس طرح قیمتوں میں کمی واقع نہ ہو۔ . . . یہی وہ سنگترے تھے جن کے لیے لورپول کے بچے ترستے تھے اور اُن کے لیے یہ ایک جنس نایاب تھی۔"[2]

وہ شخص جس نے موجودہ عہد کی تحریکات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس نظام سرمایہ داری کی اساس الحاد ہے۔ چنانچہ اس نئے "دین" کے ساتھ جو نیا فلسفۂ اخلاق دنیا میں مقبول ہوا اس کے لیے اگر کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے تو وہ صرف "مفاد پرستی" ہے۔ اس کے مطابق ہر وہ طریقہ جائز اور صحیح ہے جس سے کوئی "دنیاوی فائدہ" حاصل ہونے کی توقع ہو اور وہ کام غلط ہے جس کے کرنے سے اس میں کمی واقع ہوتی ہو۔ اس لیے اس نظام میں اخلاقی پیمانے ہر لمحے اور ہر آن ایک ایک فرد کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں یہی وہ اصل وجہ ہے کہ وہی بُجد ثروا

---

[1] Inside Latin America

[2] Hindranath Mukerjee : An Introduction to Socialism p. 16

حضرات جو وسیع المشربی اور جمہوریت کے سب سے زبردست داعی تھے اور جنہوں نے بہت زیادہ عدوجہد کے بعد مالکانِ زمین کے مقابلہ میں اپنے ووٹ کا حق تسلیم کرایا تھا۔ اس بات کے لیے تیار نہ ہوتے تھے کہ اس ووٹ کا حق وہ اُن لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بھی دے دیں جن کے رزق پر اُن کا قبضہ ہے۔ وہ اپنے لیے تو یہ حق سمجھتے تھے کہ اپنی انجمنیں بنا کر اپنے ہاتھوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں اور اس طرح اپنے مخالف طبقوں کے مقابلہ میں نہایت ہی قوت کے ساتھ صف آرا ہو سکیں مگر جب یہی حق مزدور طلب کرتے تو ان کی پیشانیوں پر تیور آجاتے اور ان کے غیظ و غضب کا طوفان کسی طرح تھمنے نہ پاتا۔ چنانچہ مزدوروں کو اپنے اتحادیئے (Unions) بنانے کا حق بہت سی کوششوں کے بعد حاصل ہوا۔ جن لوگوں نے مزدوروں کی ان انجمنوں کو کام کرتے دیکھا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی راہ میں سرمایہ دار کس طرح رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ محنت کش عوام کی مفلسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ کس طرح انہی کے اپنے طبقہ میں سے بعض ایسے منافق تلاش کر لیتا ہے جو اس کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور مزدوروں کی یک جہتی اور اتحاد کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ ملک کا سرمایہ دار روپیہ کی مدد سے غرباء کے ووٹ خرید کر حکومتوں کے ایوانوں تک پہنچتا ہے اور وہاں رسائی حاصل کر لینے کے بعد وہ حکومت کی مدد سے ان مزدوروں کو ہر قسم کی تحریکات کو قوت سے دبا دیتا ہے یہ بچارے جب کبھی اپنی مظلومیت کا احساس کرتے ہوئے سر اٹھاتے ہیں تو حکمراں طبقہ کی توپوں کے دہانے اُن پر کھول دیے جاتے ہیں۔ پروپیگنڈا کی پوری مشینری کو اُن کے خلاف حرکت میں لا کر انہیں اس طرح بدنام کر دیا جاتا ہے کہ وہ پھر جیتے جی بولنے کی جرأت نہیں کرتے۔

اس عہد میں دولت و سیاست جس طرح ایک دوسرے کے ہم رکاب ہیں اس کا اندازہ پچھلے چند سال کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ جوزف اے۔ لیگٹن (Joseph A. Leighton) نے اپنی کتاب Social Philosophies in Conflict. میں اس کی متعدد مثالیں دی ہیں جن میں سے یہاں چند نقل کی جاتی ہیں۔ ان سے صورتِ حالات کا ایک سرسری سا اندازہ ہو سکے گا۔

۱۹۳۵ء میں رائے برن بل (Reyburn Bill) پر ملک میں ایک ہنگامہ

بپا ہوا۔ سینٹ کے ممبروں اور پارلیمنٹ کے ارکان کے گھروں میں بے شمار تاریں بھیجی گئیں۔ صرف ایک شہر کی تاروں کی تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ پندرہ ہزار میں سے صرف تین اشخاص نے پیسے ادا کیے۔ افراد کو اپنے دستخط دینے کے لیے معاوضہ دیا جاتا اور افراد کے نام ڈائرکٹری (Directory) میں سے حاصل کیے جاتے۔ اکتیس ہزار تاروں میں سے جو ۲۵ شہروں سے دی گئیں، ان میں سے ۱۲ افراد وہ تھے جنہوں نے ان کی قیمت خود ادا کی۔ باقی سارے اخراجات گیس اور بجلی کی کمپنی نے برداشت کیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس بل کو ناکام بنانے کے لیے کمپنی کو آٹھ اور نو لاکھ کے درمیان رقم خرچ کرنا پڑی۔ اس نے بعض اخبارات کو یہ دھمکی دے کر تنقید سے روک دیا کہ اگر وہ اس بل کی حمایت کریں گے تو انہیں اشتہارات دینا بند کر دیے جائیں گے"۔[ل]

آپ خود اندازہ لگائیں کہ کیا ملک کا مزدور اپنی کسی بات کو حکومت سے منوانے کے لیے اس سے نصف رقم بھی صرف کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امرا حکومت کے سیاہ و سپید کے مالک ہوتے ہیں اور وہ قوانین کو جس طرح چاہتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ مزدور بیچارہ بالکل ان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر اتنی ہمت بھی نہیں رکھتا کہ یہ بھی کہہ سکے کہ حضور میرے بیمار پڑنے پر مجھے بھی با تنخواہ رخصت دی جائے۔ اور بڑھاپے کی حالت میں جب کہ بندہ نے اپنی صحت طاقت اور جوانی سب کچھ جناب کے قدموں میں قربان کر دیا ہے مجھے اتنا تو دے دیا جائے جس سے زندگی کی ٹمٹماتی لو کچھ دیر قائم رہ سکے۔ دنیا کا سرمایہ دار طبقہ جو آزادی کا نعرہ لگاتا ہوا، اور ذاتی مفاد کی برکات کا ذکر کرتا ہوا کبھی نہیں تھکتا جب اس مقام پر آتا ہے کہ یہی حق وہ دوسروں کو بھی دے تو یہاں وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں بدل جاتی ہیں۔ اس کے اخلاقی معیار تبدیل ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے سامنے ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو تجارتی چکر (Trade Cycle)

ل Joseph A. Leighton : Social Philosophies in Conflict p. ...

کے شر سے کس طرح بچائے۔ ۱۹۲۵ء کی سرد بازاری کے بعد اس سوال نے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اب دنیا کے سارے ممالک اس مصیبت کا تدارک سوچ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کا کوئی خاطر خواہ حل تلاش نہیں کر سکے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی طریقہ کارگر ہو سکتا ہے تو وہ یہی کہ حکومت عدم مداخلت کی پالیسی کو خیرباد کہہ کر ملک کی معاشی تنظیم ایک منصوبہ بندی کے تحت کرے اور اس طرح پیداوار کے سارے ذرائع وہ اپنی تحویل میں لے لے۔

جن لوگوں نے سرمایہ داری نظام کے اس روگ کا ذرا گہری نظر سے تجزیہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کے اصل اسباب معاشی نہیں بلکہ غیر معاشی ہیں۔ جب ملک کا سرمایہ دار یہ دیکھتا ہے کہ مزید سرمایہ کاری سے اُس کا منافع بڑھے گا تو وہ پھر اپنے سرمایہ کو بے دریغ مختلف صنعتوں میں لگاتا ہے۔ اس سے کام بڑھتا ہے۔ مزدوروں کو مزدوری ملتی ہے اور اس طرح اُن کی قوت خرید بڑھنے سے اُن کی طلب[1] میں کسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ نئے نئے کام شروع کرتے ہیں۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سود پر روپیہ لیتے چلے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کو جب اپنے روپے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنی شرح بڑھا دیتا ہے۔ جب یہ طبقہ پیدائش میں سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو منتقلین کا نفع کم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف گرم بازاری کے اس دور میں مزدور کو اگرچہ کام ملتا ہے، اس کی اُجرت بڑھتی ہے مگر وہ اس رفتار سے نہیں بڑھتی جس رفتار سے کہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی قوت خرید گر جاتی ہے۔ اس لیے بعض اشیاء کی طلب قدرتی طور پر گھٹ جاتی ہے۔ مگر اس معاشی تنظیم میں یہ ناممکن ہے کہ سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو جلد از جلد دوسری طرف منتقل کر دے۔

علاوہ ازیں جس طرح اہل صنعت کی مانگ میں اضافہ ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہے، اسی طرح مانگ میں کمی واقع ہونے کی صورت میں بھی انہیں کچھ عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ اب بازار سرد پڑنے لگا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر تو اس شئے

---

[1] Lord Keynes لارڈ کینز اس کے لیے موثر طلب (Effective demand) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

کی مانگ گرتی چلی جاتی ہے اور ادھر اس کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد اہلِ صنعت بازار کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر یہ محسوس بھی کر لیتے ہیں کہ اب اس کی رفتار بہت سست ہے تب بھی ان کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں وہ شئے مطلوبہ کی جو مقدار تیار کر چکے ہیں اس کی نکاسی کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں۔ یہ مصیبت صرف ایک کارخانہ دار پر نازل نہیں ہوتی بلکہ سب پر ٹوٹتی ہے۔ حتیٰ کہ پورے سماج کے لیے یہ امر دشوار بن جاتا ہے کہ اشیائے مطلوبہ کی ایک کثیر اور وافر مقدار کو بازار میں کس طرح فروخت کیا جائے۔ منافع کے امکانات ذرا تاریک ہونے کے ساتھ ہی سرمایہ دار پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس قسم کی حرکات کرنے لگتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن پر ایک زبردست خوف طاری ہے۔ وہ ایک طرف مال کی پیداوار کم کر دیتا ہے اور دوسری طرف مال کی نکاسی کی فکر کرتا ہے۔ اُس کی ان حرکات سے اشیاء کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو بڑی تعداد میں کارخانے بند ہونے لگتے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بڑی اکثریت بیکار ہو جاتی ہے اور منڈیوں کی گرم بازاری اچانک سرد بازاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ آفت جو سرمایہ دار ممالک پر آٹھویں دسویں سال نازل ہوتی ہے اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری ہے جسے دور کرنے کا کوئی طریقہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

اگر آپ اس کو ذرا غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ "دولت پرستی" کا کرشمہ ہے۔ اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ "ذاتی مفاد" ہماری زندگی کا رہنما اصول بن گیا ہے۔ اس لیے جب اہلِ ثروت یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے منافع کم ہو گئے ہیں تو وہ بڑے ہی مضطرب ہو جاتے ہیں اور سرمایہ کاری سے اس طرح ہاتھ کھینچتے ہیں کہ پورا ملک تباہی کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اگر لوگوں پر روپیہ کی محبت غالب نہ ہو تو وہ معاشی تنظیم کرتے وقت یہ سوچ لیں کہ اُن کی کسی پالیسی سے کتنے غریب تباہ ہوں گے۔ مگر سرمایہ دار کے دل میں انسانیت کی محبت سے زیادہ منافع کی محبت ہے اور اسی وجہ سے سوسائٹی بار بار تجارتی چکر کے گرداب میں پھنستی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کو جو چیز غذا بہم پہنچا رہی ہے وہ "سود" ہے۔ اس میں افراد کو یہ پورا حق دیا

گیا ہے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو جمع کریں اور پھر اسے سود پر چلائیں۔ سود ایک قابل نفرت برائی کی حیثیت سے تو پہلے بھی سوسائٹی میں چلا آتا تھا مگر جدید نظام کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اس برائی کو عین بھلائی میں، اور اس ظلم کو عین خدمت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اب معاشی نظام اس طرز پر ڈھالا گیا ہے کہ سوسائٹی بجائے پوری انسانیت کی پاسبان اور محافظ بننے کے صرف سود خواروں اور اس کے ساتھیوں کی پشت پناہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے سماج میں ایک ایسے طاقتور طبقے نے جنم لیا جو عوام سے ہر طرح کا فائدہ تو اٹھاتا ہے مگر اُن کی مصیبتوں میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہوتا۔ اُسے اگر کوئی غرض ہے تو اپنے "معین معاوضہ" سے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ کاروبار ترقی کر رہا ہے تو پھر بے دریغ ہو کر اپنا روپیہ لگاتا ہے۔ اس طرح سود کی شرح بڑھتی ہے اور پھر نفع کے امکانات مخدوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی اپنی ہی "کرم فرمائیوں" سے جب کاروبار سرد پڑنے لگتا ہے تو پھر یہ ظالم بجائے سماج کی امداد کرنے کے ان پُرآشوب حالات میں اپنا لگا ہوا سرمایہ واپس لینا شروع کر دیتا ہے۔ سرمایہ کاری میں کمی ہو جانے کی وجہ سے سوسائٹی میں کام کا دائرہ اور بھی سکڑتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا پر سخت کساد بازاری کی آفت آ پڑتی ہے۔ مگر ان حالات میں بھی نقصان، زحمت، خطرے سب دوسروں کے لیے ہیں اور وہ ان آفتوں سے بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ مشہور مفکر لارڈ کینز (Lord Keynes) نظام سرمایہ داری کی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے سود کو اس کا سب سے بڑا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اُس کا تجزیہ یہ ہے کہ سود کے بڑھنے سے منافع کے امکانات گھٹ جاتے ہیں اور جب سوسائٹی پر یہ کیفیت طاری ہو جائے تو کاروبار سرد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"یہ بحران اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ شرح سود معاشی مشین کے پہیوں کو بریک لگا دیتی ہے"

سرمایہ دار طبقہ کا یہ سنگدلانہ اور ظالمانہ رویہ صرف افراد ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قوم و ملت کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک روا رکھتا ہے۔ وہ اگر قوم اور ملک کو بھی اپنا روپیہ مستعار دیتا ہے تو اس

شرط پر کہ اُسے بہر حال اپنا "منافع" ملنا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ اگر ان پر کوئی آفت بھی آئے اور افراد کو اپنی جانوں تک کی قربانی دینی پڑے تو ان حالات میں بھی اس ذلیل طبقے کا مطالبہ بہر حال اپنی جگہ اٹل رہتا ہے کہ ان کے سرمائے پر اتنے فی صدی سود سالہا سال تک ضرور ادا ہوتے رہنا چاہیے۔ سود کے اصول پر منافع کے یک طرفہ بہاؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پوری دنیا کا معاشی توازن ہی بگڑ گیا ہے۔

یہ ہیں وہ مفاسد جو اس نظام کے تن بدن سے پیپ بن کر نکل رہے ہیں۔ ان مفاسد کو خود سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے کارپرداز محسوس بھی کرتے ہیں، اور اصلاحِ حال کی تدابیر بھی سوچتے ہیں۔ کہیں مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے، کہیں انہیں منافع میں شریک کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ کہیں انہیں علاج کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ کارلائل (Carlyle) نے جو بات کئی سال پیشتر کہی تھی وہ آج بھی اسی طرح سچ ہے۔ ترقی کے اس زمانہ میں بھی اگر ایک طبقہ اس وجہ سے چیخ رہا ہے کہ اُس کی ۲۰ لاکھ قمیصیں بیکار پڑی ہیں اور اُن کا کوئی گاہک نہیں ملتا تو دوسری طرف بیس لاکھ انسان اس لیے چلا رہے ہیں کہ اُن کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں۔ ان ساری تدابیر میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اگر آپ پچھلے پچاس سال کے حالات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیں تو معلوم ہوگا کہ معاشی ارتقاء کے لیے جس "دستِ غیب" (Invisible hand) کا سہارا لیا گیا تھا وہ بالکل فضول ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ داری کے اندھے مقلدین جو چاہیں کہتے رہیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ نظام انسانیت کی فلاح کے نقطۂ نظر سے سخت ناکام رہا ہے۔ اس میں سے جو مفاسد اُبھر کر سامنے آئے ہیں اُن کی روک تھام کی ساری کوششیں بالکل عبث اور بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ اور اُن کا حاصل صرف یہی ہے۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

جو اصحاب سرمایہ دارانہ نظام کے جمہوری پہلو پر مزید مطالعہ فرمانا چاہیں وہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔
(بقیہ بر صفحہ ۱۴۴)